© rasailojaraid.com

خدا کی پُراسرار شخصیت کا تصوّر

(جناب مولوی محمد فاروق خاں صاحب کرہنڈہ ضلع اعظم گڈھ)

قرآنی تعلیم و تربیت کی غرض و غایت اور ہمارے دین و ایمان کی انتہا خدا کی محبت ہے۔ ہم چاہے اس کا اظہار کامل اطاعت اور قلبی ایثار کے الفاظ سے کریں یا اس کی تعبیر احسان کیشی اور احسان شناسی کی روش سے کی جائے۔ ایسے محسن و مہربان اور اپنے بندوں سے محبت فرمانے والے خدا کی محبت سے ہمارے دل خالی ہوں اس سے بڑھ کر احسان فراموشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ دین میں مطلوب بالذات خدا کا ذکر اور توجہ الی اللہ ہے۔ محبتِ الٰہی عبودیت کی روح اور خدا پرستانہ زندگی کی جان ہے۔ ہماری روحانی زندگی اسی سے عبارت ہے۔ محبتِ الٰہی تمام پیغمبروں کی تعلیمات کا مرکز رہی ہے۔ قرآن نے مختلف مقامات پر اس کی وضاحت کی ہے کہ خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ محبت کا رشتہ ہے۔

جب محبتِ الٰہی ہمارے سارے اعمال و احوال کا محور ہے تو ہمارے لئے اس مقصود کا حاصل کرنا کتنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں خدا کی صحیح معرفت حاصل ہو اور ہم خدا کی ذات اور اس کی شخصیت کا زندہ تصور رکھتے ہوں۔ اس کے بغیر نہ تو ہمارے دلوں میں خدا کی محبت کا صحیح جذبہ اُبھر سکتا ہے اور نہ ہمارے اندر حضوری کی وہ کیفیت پیدا ہو سکتی ہے جسے حدیث میں "احسان" سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

یہ تصور کہ ———— خدا کے بارے میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایسا نہیں ہے، ایسا نہیں ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایسا ہے اور ایسا ہے۔ کیونکہ ایجابی طور پر جو نقشہ بھی بنایا جائے گا وہ ہمارے ہی ذہن و فکر کا ایجاد کردہ ہوگا اور ہمارا محدود ذہن، مطلق اور لامحدود کا تصور کرنے سے عاجز ہے۔ ———— یہ وہ بنیادی خیال ہے جس کے سبب بالعموم لوگ خدا کی ذات کے بارے میں کسی طرح کا تصور قائم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے کو صحیح نہیں سمجھتے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ محض سلبی (NAGATIVE) تصور کے تحت ہم ہستی کو نیستی سے جُدا اور ممتاز نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے سامنے کوئی نہ کوئی ایجابی (POSITIVE) پہلو بھی ہو۔ فطری طور پر قلب موجود کی طرف مائل ہوتا ہے، معدوم کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ اسی لئے قرآن نے سارا زور اثبات پر صرف کیا ہے، نفی سے متعلق ایک جامع بات یہ فرما دی گئی ہے کہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ "اس کے مثل کوئی شے نہیں ہے۔ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔

سلبی تصور کو انسانی ذہن پکڑ نہیں سکتا حالانکہ اس کے اندر "طلب" ایک مطلوب کی ودیعت کی گئی ہے جو اس کی پکڑ میں آ سکے۔ اس کی روح ایک ایسے جلوۂ محبوبی کی طالب ہے جس کی محبت اس کی رگ و پے میں سما سکے۔ جس کے حُسنِ گریزاں کے پیچھے والہانہ دوڑنے پر وہ مجبور رہو۔ جس کے دامنِ کبریائی کو تھامنے کے لئے اس کا دستِ عجز و نیاز بڑھ سکے۔ سلبی تصور سے ہمارے طلب کی پیاس نہیں بجھتی۔ ایسا تصور صرف فلسفیانہ تخیل پیدا کر سکتا ہے، دل کا زندہ اور سرگرم عقیدہ نہیں بن سکتا۔

ذات خدا کی پوشیدگی

خدا کی ذات ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ ہماری آنکھ کو ایسی طاقت حاصل نہیں کہ وہ خدا کی ذات کا مشاہدہ کر سکے۔ خدا کی ذات کی یہ پوشیدگی ہمارے اعتبار سے ہے ورنہ وہ تو بالکل ظاہر اور کمال درجہ نورانیت کے ساتھ ہر طرف جلوہ فگن ہے۔ کائنات کی تمام چیزیں اسی کے سبب ظاہر اور موجود ہیں۔ ظہور کا اصل سبب تنہا اُسی کی ذات ہے۔

محدود طاقت رکھنے والی بینائیاں صرف اس چیز کا ادراک کر سکتی ہیں جو محدود ہو۔ جس میں کمی بیشی ہوتی ہو۔ جس کے ظہور کے ساتھ کبھی خفا بھی ہو۔ جس کی کوئی ضد ہو جس کے سامنے آ کر وہ نمایاں ہو سکے۔ لیکن ذاتِ مطلق محدود نہیں۔ اس کا نور شدید اور لازوال ہے، اس کا ضد مقابل کوئی نہیں۔ نہ کوئی اس کا ہمسر و ہم رتبہ ہے۔ وہ ایسی بسیط و محیط ذات ہے جو ہر طرف یکساں شان سے چھائی ہوئی ہے۔ کمال نورانیت کا مشاہدہ محدود طاقت رکھنے والی بینائیوں سے ممکن نہیں۔ فرطِ ظہور ہی وہ پردہ ہے جو خدا کی ذات کو نگاہِ مخلوق سے چھپائے ہوئے ہے۔ دنیا میں سورج کی روشنی کا ادراک ہمیں اس لئے ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے سے کبھی وہ ہٹ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی جاتی ہے۔ ہر جگہ ہمیشہ اگر یکساں شدت کے ساتھ دھوپ موجود رہے تو ہمیں اس کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح آواز کی تیزی اگر حد درجہ بڑھ جائے تو اس کا ادراک بھی نہ ہو سکے۔

حق تعالیٰ نے اپنے کو نگاہِ مخلوق سے چھپا کر انسان کو عقل کی روشنی میں آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ خود ہی تلاش و جستجو سے اُسے پائے، خود اپنی عقل و بصیرت سے اُسے پہچانے اور اُس کا زندہ تصور حاصل کر سکے۔ اور خود اپنی مرضی اور اپنے ارادہ سے اس کی بندگی اختیار کرے۔ اس پوشیدگی سے مقصود دراصل انسان کے ارادہ و اختیار اور عقل و ضمیر کی آزمائش ہے۔ اس کے علاوہ ہماری اخلاقی تربیت کے مصالح کی رعایت بھی اسی طرح ممکن تھی کہ وہ اپنے کو ہم سے چھپا کر اور رہنمائی کے سارے اسباب فراہم کر کے ہمیں ان کے درمیان اپنی تلاش و جستجو میں آزاد رکھتا۔

راہ کی مشکلات خدا کی حکمت نے عالمِ غیب اور عالمِ شہود کے مابین اسباب و علل کے اتنے پردے ڈال رکھے ہیں کہ نگاہیں ان حجابات کو پار کرنے سے بالعموم عاجز رہ جاتی ہیں۔ وہ ظاہری اسباب کے پیچھے کارفرما حقیقت کا ادراک نہیں کر پاتیں۔

انسان محسوسات کے سایہ میں پیدا ہوتا، پلتا اور بڑھتا ہے۔ یہ حواس کا توسط جو ہماری زندگی کے ساتھ لگا ہوا ہے، فطرت کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے اور عمر بھر باقی رہتا ہے۔ اس کے لئے ایسی چیز کا تصور و تعقل جو مجرّدِ محض ہو جس کے ادراک میں حواس کا کہیں واسطہ بیچ میں نہ آتا ہو، بے حد مشکل ہے۔ انسان سماعت، بینائی، علم و ارادہ اور قدرت وغیرہ صفات کی صرف ایسی مخصوص اور محدود صورتوں سے واقف ہے جن کا عالمِ محسوسات میں وہ مشاہدہ کرتا ہے؛ وہ ان صفات کی اطلاقی صورت سے قطعاً ناواقف ہے۔ اس لئے کسی ایسی ہستی کے تصور کرنے میں جو اطلاقی صفات سے متصف ہو اُسے جلدی کامیابی نہیں ہوتی۔ عقلِ انسانی کے نزدیک کسی ایسی بسیط و محیط ہستی کا موجود ہونا ناممکن نہیں ہے جو اپنی اطلاقی شان سے ہر چہار طرف چھائی ہوئی ہو لیکن ایسی بالاتر شخصیت کا تصور و تعقل اس کے لئے بے حد دشوار ہے۔ انسان جب کبھی کسی محسوسات سے ماوراء ہستی کا تصور کرتا ہے تو شعوری یا غیر شعوری طور پر اُسے بھی محسوس شکل دینے لگ جاتا ہے۔ محسوسات سے ماوراء لطیف ذات اس کے واہمہ پر بالکل مشتبہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک محسوس شکل و صورت ہی کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تخصیص اور ہستی کا تصور ممکن ہے۔ ہوا اور بجلی کے وجود کے تسلیم کرنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوتی حالانکہ ان میں سے کسی تک اس کی نگاہ کی رسائی ممکن نہیں۔ وہ بہت سے مجردات کو مانتا ہے جنھیں اس کی آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا۔ خدا کے ماننے میں بھی اُسے جو دشواری پیش آتی ہے وہ یہ نہیں کہ اس کے وجود کو کیونکر تسلیم کیا جائے جب کہ وہ محسوسات سے ماورا اور اپنی دسترس سے دور ہے۔ اصل دشواری اس کی ذات کے تعقّل اور اس کی تخصیت کے تصور میں ہے۔ انسانی عقل اس چیز کو جلدی باور نہیں کرپاتی کہ محسوسات سے ماورا وجود بھی تخصی اوصاف کا حامل ہو سکتا ہے۔ اصل دشواری اس کے نزدیک یہی ہے کہ ایک لطیف اور غیر محسوس وجود تخصی اوصاف سے کیونکر متصف ہوگا۔ اطلاق کے ساتھ تشخّص کو باقی رکھنا اس کے لئے کوئی آسان بات نہیں ہے۔

کارخانۂ خلق و ایجاد میں پردہ داری کا ایسا اہتمام پایا جاتا ہے کہ حقیقت کے حسن و کمال کا مشاہدہ بے حد مشکل ہے۔ ہمارا وجود ظاہری خود ہمارے لئے ایک بڑا حجاب ہے۔ ہمارے حواسِ خمسہ قوتِ لامسہ ہو یا قوتِ ذائقہ، قوتِ شامہ ہو یا قوتِ باصرہ و سامعہ پردہ داری کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ہم قوتِ علم و ادراک کی کسی ایسی قسم سے واقف نہیں ہیں جس سے بیرونی دنیا کے واقعات اور خارجی چیزوں کا علم بغیر کسی واسطے سے حاصل ہو۔ اسی طرح ظاہری شکل و شباہت اور آب و رنگ سے ہٹ کر کسی حسن و جمال کا تصور بھی ہمارے لئے بالکل نیا تصور ہے جس کا حصول ہمارے لئے حد درجہ مشکل ہے۔

وجود اور اوصافِ وجود

خدا کے تصور میں جو چیزیں مانع ثابت ہو رہی ہیں ان پر قابو پانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ مخلوق کا اپنے وجود کے لحاظ سے خالق کے ساتھ کس نوعیت کا تعلق ہے۔ ممکنات کے مادہ کا جو تعلق خدا کی ذات سے ہے اس کی نوعیت شریعت نے واضح نہیں کی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے جو کچھ کہا ہے اس سے زیادہ سمجھنے کی صلاحیت بھی ہمارے اندر نہیں ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ	اس کی شان یہ ہے کہ جب اس نے (خدا نے)
لَهُ كُنْ فَيَكُونُ	کسی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو کہا کہ
....	ہو جا بس وہ چیز معرضِ وجود میں آگئی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مخلوقات خدا کے ارادہ کا ظہور ہیں۔ وہ خدا کی قوتِ ارادی کی متمثل صورت ہیں خدا کی قوتِ ارادی کو ہم خدا کے امر (Directive Force) سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ہماری قوتِ متخیلہ تصورات کی دنیا میں بہت سی چیزوں کی تخلیق کرتی رہتی ہے۔ ہماری خیالی مخلوق اپنے وجود و بقا اور ذات وصفات کے لحاظ سے ہمیشہ ہماری مسلسل تخلیقی توجہ کی دستِ نگر رہتی ہے۔ ہم اور ہماری خیالی مخلوق ایک ہی مکان میں سمائے ہوئے ہیں اگر دونوں یکساں حیثیت کے مالک ہوتے تو کبھی بھی ایک مکان میں دو مکینوں کی گنجائش نہ پیدا ہو سکتی۔

اس مثال سے کسی قدر اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مخلوق کا اپنے خالق سے وجود کے اعتبار سے کس نوعیت کا تعلق ہوتا ہے۔ عالم کی تعمیر کا آخری سرمایہ خدا کی صفات ہی ہو سکتی ہیں۔ مخلوقات کے وجود کے اصل خدا کا وجود ہے۔ وجودِ حقیقی پر انتہائی بے قیدی اور لاتعیّنی کے لحاظ سے نظر کیجئے تو عقل اس کے ادراک سے عاجز رہ جاتی ہے۔ البتہ ظہور کے اعتبار سے اس کے بے شمار مراتب ہیں۔ مرتبۂ الوہیت اور مرتبۂ عبودیت کو متحد کرنا کفر ہے جس طرح دھوپ کا مادہ آفتاب کا نور ہے مگر دھوپ کی مختلف شکلیں روشندان اور صحن وغیرہ کی تقطیعات کے موافق اس پر عارض ہوتی ہیں۔ اسی طرح مخلوقات کی اصل تو ایک ہے مگر ان کی مختلف صورتیں خدا کے علم و ارادہ کے موافق اس پر عارض ہوتی ہیں۔

مخلوقات خدا کے وجود سے فیضیاب ہونے کے باوجود مخلوق ہیں خدا نہیں۔ مخلوق سے وجود کا تعلق ذاتیت کا نہیں عرضیت کا ہے۔ وجود کو صدور اور اوّلیت کی نسبت صرف خدا کی ذات سے ہے۔ مخلوقات کے ساتھ وہ صرف ثانویت اور رو توع کی حیثیت رکھتا ہے۔ کائنات کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ یزدانی توانائی (DIRIME ENERGY) نے مرئی شکل اختیار کر لی۔ یہ کائنات اور اس کی تمام تفصیلات مادی ایٹم، الکٹرون اور پروٹون کی میکانی حرکت سے نے کر نفسِ انسانی کی فکری آزادی تک سب ایک خدا کے وجود کے کرشمے ہیں۔ یزدانی توانائی سے میری مراد خدا کی ذات نہیں بلکہ اس کی تخلیقی توانائی ہے۔ کائنات سے متعلق خدا کا وہ وجود نہیں جو اس کی ذات کے ساتھ قائم اور باقی رہنے والا ہے بلکہ وہ وجودی شعاعیں ہیں جو اس کی ذات سے نورِ آفتاب کے مثل منعکس ہو رہی ہیں۔ مخلوقات کا مبدا ار (ORIGIN) خدا ہے۔ مبدا ار میں تمام وجودی صفات بحالتِ اطلاق پائی جائیں گی۔ صفاتِ الٰہی میں سے ایک حصہ

© rasailojaraid.com

پانا الوہیت کا کوئی جز پالینے کا ہم معنی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ الوہیت اس سے بالکل وراء الورا ہے جس کی کنہ کو انسان نہیں پا سکتا۔

جدید سائنس (MODERN SCIENCE) کی تحقیقات کے لحاظ سے کائنات توانائی کی ایک کثیف ترین شکل ہے۔ ایک توانائی دوسری توانائی میں تبدیل بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً روشنی (LIGHT) کو حرارت (HEAT) میں اور حرارت کو برق (ELECTRICITY) میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اب تو یہ بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ مادہ (MATTER) اپنی اصلیت کے اعتبار سے ایک برقی رو نہیں محض خیالی امکان کی لہر ہے۔ اس طرح انیسویں صدی والی وہ خلیج جسے نادانوں نے مذہب اور سائنس کے درمیان پیدا کر دی تھی اب غائب ہوتی نظر آ رہی ہے۔ بیسویں صدی کی سائنس، مذہب کے ساتھ دوستانہ طرز اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اب دونوں میں کوئی اجنبیت باقی نہیں رہی۔ اس نئی تبدیلی کے بارے میں جوڈ (C.E.M. JOAD) نے لکھا ہے:

"فوری اثر اس نئی تبدیلی کا یہ ہے کہ اب طبیعی حضرات (PHYSICISTS) کو بڑھتی ہوئی ضرورت محسوس کر رہے ہیں کہ اُن مسائل کو حل کرنے کے لئے جنہیں طبیعات (PHYSICS) پیدا کرتا ہے علم طبیعات کے دائرے سے باہر جانا پڑے گا۔ اب چونکہ فلسفہ (PHILOSOPHY) کی ضرورت محسوس ہو رہی۔ اس لئے جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے علمائے طبیعات خود فلاسفروں کی طرح غور کرنے لگ گئے ہیں۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اس ظاہری دنیا کے علاوہ ایک دنیا اور ہے۔ یہ دوسری دنیا ان کے نزدیک ایک روحانی دنیا۔ MENTALOR (SPIRITUAL JNITY) ہے اور مادہ محض اس کی ظاہری علامت (APPEARANCE) ہے۔ اب اس کے آگے بھی ایک اعلان ہے کہ درحقیقت محض نفس (MIND) ہی ایک حقیقی شے (REAL) ہے اور مادہ اس کی تخلیق ہے۔ یہ اعلان موجودہ دور کے علمائے طبیعات ایسی آمادگی

© rasailojaraid.com

اور یقین کے ساتھ کرتے ہیں جس طرح آج سے پچاس سال پہلے ان کے مادہ پرست متقدمین (MATERIALIST PREDECESSORS) یہ دعویٰ کرتے تھے کہ صرف مادہ ہی حقیقت (REA..) ہے اور نفس (MIND) صرف اس کا ایک نہایت معمولی مظاہرہ (UNIMPORTANT EMANATION OF MATTER) ہے۔"

(GUID TO THE MODERN THOUGHT BY C-E-M- JOAD P- 18 TO 21)

آئن اسٹائن کے نظریہ کے لحاظ سے کائنات چند مربوط حوادث یا منجمد خیالات (CONDENSED THOUGHT) کا مجموعہ ہے جس کی اصل حرکت یا توانائی ہے نظریۂ اضافیت نے زمان کو "زمان۔ مکان" (TIME - SPACE) میں سمو کر مادیت کے روایتی تصور کو صد درجہ مجروح کر دیا ہے۔ عام تصور کے لحاظ سے مادہ وہ ہے جو زمان میں قائم اور مکان میں گردش کرتا ہے لیکن نظریۂ اضافیت کی رو سے یہ تصور باطل ہے۔ اب مادہ صرف مربوط حوادث کا مجموعہ بن چکا ہے۔ اب یہ کائنات کوئی ٹھوس شے نہیں ہے جو فضا میں پڑی ہو بلکہ صرف حوادث (EVENTS) کی عمارت ہے یا صرف عمل (ACTION) - جیمس جینز کے نزدیک یہ سب دراصل ذہن کی پیداوار ہیں۔

برٹرینڈ رسل کے نزدیک بھی مادہ محض حوادث کی مجرد ریاضی خصوصیات کا نام ہے۔ یہ سمجھنے کے لئے کہ کوئی حادثہ کس طرح وقوع پذیر ہوا، مادہ ایک فارمولا (FORMULA) کا کام دیتا ہے۔ اسپنسکی (OUSPENSKY) کے الفاظ میں مادہ ایک حالت (CONDITION) ہے جس طرح اندھا پن (BLINDNESS) کوئی شے نہیں ہے محض ایک حالت کا نام ہے۔ گویا ہم یہاں حقیقتِ واقعی کا بہ نفس نفیس مطالعہ نہیں کرتے صرف حقیقت کی پرچھائیوں تک ہی ہماری رسائی ہو پاتی ہے۔ مادہ بذاتِ خود کوئی حقیقی شے نہیں ہے بلکہ وہ حقیقت کی محض ایک علامت ہے۔ بہر حال موجودہ سائنس اس آگہی تک آ پہنچی ہے کہ اس کائنات کی میکانی تشریح اب ممکن نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

کائنات خدا کی الوہیاتی توانائی کے بل پر چل رہی ہے جس طرح آفتاب کی شعاعیں آمد کے وقت محسوس نہیں ہوتیں انھیں ہم اس وقت محسوس کرتے ہیں جب کسی چیز پر پڑنے کے بعد ان کا انفصال ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ذاتِ خداوندی اور اس سے وجودی شعاعوں کی آمد کا ہمیں ادراک نہیں ہوپاتا لیکن ان کے صدور تک ہمارے مشاہدہ کو رسائی ہوجاتی ہے اجمال اور اجماع میں خفا ہوتا ہے۔ اور تفصیل و انفصال میں ظہور۔ چونکہ تفصیل صدور پر موقوف ہے اسی لئے صدور ہمارے حدود مشاہدہ سے باہر نہیں ہوتا سینما دیکھنے والوں کو روشنی اور اس کے ساتھ تصویروں کی آمد کا ادراک نہیں ہوپاتا لیکن وہی تصویریں صدور کے وقت پردہ پر بالکل نمایاں ہوجاتی ہیں۔

اثباتِ روحِ انسانی حیات کے میکانی تصور کی رو سے جسم کے تمام ظاہری و باطنی حواس سے کام لینے والا صرف انسان کا دماغ (BRAIN) ہے۔ انسان اپنی جسمانی خصوصیات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دماغ کے مختلف حصوں میں ہر حصہ کسی خاص قوت کا منبع ہے۔ ہم دماغ کے اندر کوئی ایسی مرکزی قوت ثابت نہیں کرسکتے جو ان تمام قوتوں کو آلہ (INSTRUMENT) کے طور پر استعمال کرتی ہو۔ اگر دماغ کے اندر اس طرح کا کوئی مخصوص مرکزی حصہ مل بھی جائے۔ جب بھی تجربات سے یہ ثابت ہے کہ جو چیز جسمانی یا جسم کا کوئی حصہ ہوگی اس کی حیثیت ایک آلہ کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتی۔ جب وہ جسم نہ ہوگی تو جسم کی ساخت اور ترکیب کی کوئی کیفیت بھی نہیں ہوسکتی کیونکہ مزاج، ترکیب اور تمام اعراض جسم کے تابع ہوتے ہیں۔ وہ جسم کے تمام ظاہری و باطنی اجزا پر حکومت نہیں کرسکتے۔ اس لئے چاروناچار ہم ایک ایسی قوت کے ماننے پر مجبور ہیں جو جسمانی نہ ہو مگر جسم کے تمام اعضاء جوارح پر تنہا اسی کا قبضہ ہو۔

جسم چھوٹے چھوٹے مختلف شکل کی کوٹھریوں کے مجموعہ سے بنا ہے۔ انھیں مسام (CELLS) یا خلیہ کہتے ہیں۔ بہت سے پیڑ اور حشرات الارض صرف ایک خلیہ سے بنے ہوتے ہیں جنھیں صرف خوردبین سے دیکھا جاسکتا ہے۔ آنکھوں سے نظر آنے والے تمام ہی درخت اور حیوانات مساموں کی ایک بڑی تعداد سے مل کر بنے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا وجود ایک مسام سے ہی شروع ہوتا ہے جس طرح کوئی عمارت ہزاروں

© rasailojaraid.com

اینٹوں کی بنی ہوتی ہے اسی طرح کروڑوں خلیوں سے انسانی جسم تیار ہوتا ہے۔

ایک قسم کے مساموں کے جھنڈ کو جو محض ایک طرح کا مقررہ کام کرتے ہیں نسیج (TISSUE) کہتے ہیں۔ ایک ہی طرح کے کام کرنے والے مسام جب جسم کا کوئی ایسا حصہ بناتے ہیں جو جسم اور خاصیتوں کے لحاظ سے دوسرے حصوں سے ممتاز ہوتا ہے اسے عضو (ORGON) کہتے ہیں۔ ہر عضو کا اپنا ایک مخصوص کام ہوتا ہے جسے وہ انجام دیتا ہے۔ تاہم تمام اعضاء کے کاموں میں باہم یک جہتی (CO-ORDINATION) رہتی ہے۔ کئی اعضاء باہم مل کر ایک طرح کا کام کرتے ہیں تو انھیں ہم ایک نظام کے ماتحت رکھ سکتے ہیں۔ ہمارے جسم میں نظامِ تنفس، نظام عضلات، نظامِ عصبی (NERVOUS SYSTEM)، نظام دافعہ، نظامِ دوری (CIRCULATORY SYSTEM) وغیرہ مختلف نظام ہیں۔

جسم کے مسامات ٹوٹتے اور ٹوٹ کر دوسرے نئے مسامات میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ دس سال کے بعد انسان کے جسم میں پہلے کا ایک خلیہ بھی اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہتا۔ جسم کے تمام خلیے بالکل بدل چکے ہوتے ہیں۔ گویا دس دس سال کے بعد ہمیں بالکل دوسرا نیا جسم مل جاتا ہے۔ لیکن اس عظیم جسمانی تغیر کے باوجود ہماری شخصیت اس سے بالکل متاثر نہیں ہوتی۔ ہماری شخصیت وہی رہتی ہے جو دس سال پہلے تھی۔ اس لئے لازماً ہمارے جسم کے ساتھ کوئی ایسی چیز ضرور ہے جس پر جسمانی تغیرات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہماری شخصیت اگر محض ہمارے جسم کے طبعی افعال کا نتیجہ ہوتی تو جسم کے ساتھ ساتھ وہ بھی بدلتی رہتی۔ پھر زید وہی زید باقی نہ رہتا جو دس سال پہلے تھا۔ اور نہ اسے اس اہم تبدیلی کی خبر ہو سکتی۔ جسم کے اندر تغیرات سے بالاتر، مادہ سے الگ مستقل اور بذات خود مکمل جس وجود کا پتہ چلتا ہے اُسے ہم روح (SOUL) سے تعبیر کرتے ہیں۔ تمام شخصی اوصاف شعور، علم و ارادہ وغیرہ اسی روح کے کرشمے ہیں۔

تحقیقِ جدید نے بھی اس مفروضہ کو غلط قرار دیا ہے کہ شعور اور علم و ارادہ وغیرہ صفات دماغ کی پیداوار ہیں۔ شعور کا الگ مستقل وجود ہے۔ دماغ کی وساطت سے صرف وہ اپنے کو مشہود کرتا ہے۔ جس طرح آواز فضائی لہروں میں موجود ہوتی ہے ریڈیو سٹ کی اسے پیداوار نہیں کہہ سکتے۔ ریڈیو سٹ کی وساطت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے صرف اس کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اگر انسان کی شخصیت محض اس کے جسمانی افعال کا نتیجہ ہوتی جیسا مادہ پرستوں کا خیال ہے تو اس کا مستقل اور مسلسل ایک حالت پر قائم رہنا ممکن نہ ہوتا۔ شعور کو اگر مادی ارتقاء کا نتیجہ تسلیم کر لیا جائے تو اس کی کوئی مستقل حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اس طرح تو اس کا تمام تر انحصار اس شے کے عمل پر ہوگا جس سے اسے ارتقاء کا بلند مقام حاصل ہوا ہے۔

اوسپنسکی (OUSPENSKY) کے الفاظ میں دماغ (BRAIN) وہ منشور (PRISM) ہے جس میں سے نفس انسانی کی شعاعیں گذرتی ہیں تو ان کا ایک حصہ ہمارے سامنے شعور و فکر کی صورت میں ظاہر (MANIFEST) ہو جاتا ہے۔

(TERTIUM ORGANUM P. 164)

دماغ کے مختل ہو جانے سے نفس انسانی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ دماغ ایک آئینہ ہے جس کے اندر شعور کی مثالی شکلیں نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔ دماغ کے مختل ہونے سے اس کے عکوس (MANIFE-STATIONS) متاثر ہوتے ہیں۔

صرف یہ کہہ دینے سے کہ انسان آکسیجن، سوڈیم، پوٹاشیم، سلفر، کلورین، آٹیرن، آیوڈین کیلشیم اور میگنیشیم کا مجموعہ ہے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ پروفیسر اشادٹ نے ذہن انسانی کی نیرنگیوں کا اندازہ کر لے لکھا ہے کہ ذہن کا مادہ سے پیدا ہونا نیچر کے سارے نظام کے منافی و مناقض ہے۔ یہ گویا عدم سے وجود کی تخلیق کے معجزہ کو تسلیم کرنا ہے۔ (MIND AND MATTER P. 116)

مغرب کی مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور ماہرین نے اس سلسلہ میں تجربات بھی کئے۔ مختلف لوگوں پر تنویم (HYPNOTHISM) سے وہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسانی جسم میں روح کا ایک الگ مستقل وجود ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیقات کو کتابی شکل میں محفوظ کر لیا ہے

مشکلات و موانع کی حقیقت

کسی شخصیت کے تصور کے لئے تشخصی اوصاف کا ذہن میں آنا ضروری ہے۔ ہم تشخصی اوصاف و کمالات کے بغیر کسی شخصیت کا تصور نہیں کر سکتے۔ حیات، علم، ارادہ، شعور وغیرہ صفات کے بغیر شخصیت کا تصور ممکن نہیں۔ ایک کامل و اکمل ذات میں ان صفات کا کمال درجہ میں موجود ہونا ضروری ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے ساتھ ہی اس کا حسن وجمال کی مالک ہونا بھی لازم ہے۔ اس کے بغیر کسی کامل شخصیت کا تصور ممکن نہیں۔

یہاں اصل دشواری یہ پیش آتی ہے کہ ہم ان وجودی صفات سے محض مثالی و اضافی صورت میں واقف ہیں۔ خدا کی ذات مطلق اور تعینات و تحدیدات سے ماوراء ہے۔ اس لئے صفات بھی اس کے ساتھ مطلق اور تعینات سے ماوراء ہوں گے۔ خدا دیکھنے کے لئے ہماری طرح آنکھ نامی عضو کا محتاج نہیں ہے۔ نہ سننے کے لئے اُسے کانوں کی احتیاج ہے اور نہ کلام کرنے کے لئے زبان نامی کسی عضو کو حرکت میں لاتا ہے۔

اس مادی دنیا میں اشیاء کی حقیقتیں مادی آلائشوں سے حد درجہ آلودہ ہیں۔ یہاں حقیقتوں کا ظہور مادی لباسوں میں ہوتا ہے۔ یہاں جو چیز جتنی زیادہ لطیف اور مجرّد ہوگی وہ اتنی ہی زیادہ مخفی اور ہماری عقل و شعور کی دسترس سے دور ہوگی ہمیں موجودِ حقیقی کی معرفت حاصل کرنے کے لئے اپنی بساط کی حد تک اُن اوصاف کی معرفت حاصل کرنی ہوگی جو مثالی یا اضافی نہ ہوں۔ اس سلسلہ میں جب ہم انسانی صفات علم و ارادہ سماعت و بصارت اور حسن و زیبائی وغیرہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے ذریعہ ہمیں صفات کے اعلیٰ مراتب کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ انسانی وجود سے جن وجودی صفات کا مظاہرہ ہوتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے صفات کا ایک ہلکا سا پرتو ہیں جنھیں اس کی رحمت نے اس کالبدِ خاکی پر ڈال رکھا ہے۔ اسی پرتو کے سبب زمین پر اُسے خدا کی خلافت کا منصب عطا ہوا۔

ہماری بصارت و سماعت کا تحقق درحقیقت وہیں جاکر ہوتا ہے جہاں روح اپنی ذات سے سنتی اور دیکھتی ہے۔ روح کی سماعت اور بصارت، روحانی ادراک کا دوسرا نام ہے۔ روح کے ادراک کے بغیر نہ دنیا کی کوئی چیز دیکھی جاسکتی ہے اور نہ اس کے بغیر کسی آواز کی سماعت ہی ممکن ہے۔

روح تک کسی چیز کا رنگ اور جسم نہیں پہنچتا۔ روح تک پہنچنے سے پہلے یہ لطافت میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ مادی چیزوں کو بتدریج آنکھ اور دماغ (BRAIN) وغیرہ کے واسطوں سے گزار کر لطافت کے درجہ میں لایا جاتا ہے، اس کے بعد روح کو اس کا ادراک ہوتا ہے۔ نظامِ جسمانی میں دیکھنے سننے کا اصل مرکز دماغ ہے۔ دماغ میں حواسِ خمسہ کی حیثیت مختلف نہیں رہتی، ان میں انفصال اور تفریق صرف دماغی مرکز سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مٹ کر ہی ہوتا ہے۔ روح میں تو بدرجۂ اولیٰ سماعت و بصارت اور دوسرے اوصاف کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ روح ایک جامع صفت سے متصف ہے گو انفعال کے وقت اسی ایک صفت کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ لیکن اصل منبعِ صفات میں اس کے سارے ہی پہلو ایک نقطہ پر جمع ہوتے ہیں۔ روح کی مخفی قوتیں اگر بیدار ہو جائیں تو واسطوں کے بغیر بھی اس میں دیکھنے اور سننے کی صلاحیت موجود ہے۔ آج بھی ہر خارجی چیز کا مشاہدہ اس کے لئے خود اپنی ذات کا مشاہدہ ہے۔ البتہ اس مشاہدہ کے لئے ابھی وہ خارجی حواس سے بالکل بے نیاز نہیں ہو سکتی۔

ہماری سماعت و بصارت رُوحانی ادراک کا دوسرا نام ہے۔ روحانی ادراک ایک لطیف اور بے کیف ادراک ہے۔ انسان جامع صفات و کمالات کا مالک ہے۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے اور اس پر جو کیفیات بھی وارد ہوتی ہیں وہ سب اس کے اندر پہلے سے بالقوہ موجود ہوتی ہیں۔ کوئی داخلی اور خارجی تحریک کے اندر وہ چیز پیدا نہیں کر سکتی جو انسان کے اندر پہلے سے بالقوہ موجود نہ ہو حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام جو تعلیم ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں وہ ہماری فطرت کی آواز ہوتی ہے۔ انبیاء جن حقائق سے ہمیں آگاہ فرماتے ہیں ہم ان سے بالکل ناواقف نہیں ہوتے صرف انھیں بھولے ہوتے ہیں۔

ہم جب کسی چیز کو خارج میں دیکھتے ہیں تو اس مرئی شے کی ایک اصل جو ہمارے اندر بھی موجود ہوتی ہے نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس طرح درحقیقت دیکھتے یا سنتے وقت ہمیں اپنے باطن ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے[1] عالمِ ظاہر میں حسن و جمال، خوش گلوئی اور حسنِ صوت وغیرہ سے ہمیں واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ درحقیقت وہ حقیقی حسن و جمال اور حسنِ صوت وغیرہ کی محسوس علامتیں ہیں ان محسوس علامات کے پرستار ہم صرف اس لئے بن جاتے ہیں کہ ہمارے خیال میں سماعت و بصارت کا تعلق محض محسوس

---

[1] مولانا رومؔ نے کتنا صحیح فرمایا ہے:

لطف شیرو انگبیں عکسِ دل ست — ہر خوشی آں از دلِ ما حاصل ست

نورِ نورِ چشم خود نورِ دل ست — نورِ چشم از نورِ دلہا حاصل ست

باز نورِ نورِ دل نورِ خدا ست — کو ز نورِ عقل و حس پاک و جدا ست

پرتوِ روح ست نطقِ چشم و گوش — پرتوِ آتش بود در آب جوش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مبصرات و مسموعات سے ہے۔ ان کے بغیر ہمارے ذوقِ سماعت اور بصارت کی تسکین کے لئے کچھ باقی نہ رہے گا۔

ہم جب عالمِ ظاہر میں کچھ دیکھتے یا سنتے ہیں تو درحقیقت اس وقت رائی اور مرئی یا سامع اور مسموع کے درمیان ایک قسم کی وحدت (UNITY) وجود میں آتی ہے۔ اس وقت مُدرِک ہی سے مُدرَک کا اظہار ہونے لگتا ہے یہی اظہار کی وہ کیفیت ہے جسے ہم "دیکھنے" یا "سننے" سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہاں یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ انسان دنیا میں صرف حسن و جمال ہی کا تو مشاہد نہیں ہے۔ اُسے قبیح صورتوں اور کرخت آوازوں سے بھی سابقہ پیش آتا ہے تو کیا اسے بھی اس کے باطن کا کرشمہ کہا جائے گا؟ جواباً عرض ہے کہ انسان کا باطن صرف حسن و جمال کا مرقع ہے، اُسے قبیح صفات سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اوصاف و کمالات کی حیثیت وجودی ہے، نقائص و عیوب کی حیثیت عدمِ محض ہے۔ تاریکی کا کوئی وجود نہیں روشنی کے زوال کو ہم تاریکی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مصائب و مشکلات کی حیثیت وجودی نہیں ہے، آرام و چین کے چھن جانے کا دوسرا نام مصیبت ہے۔ خدا کی طرف سے صرف محاسن کا نزول ہوتا ہے۔ جب وہ کسی حکمت کے تحت انھیں سلب کر لیتا ہے، تو عیوب و نقائص ظہور میں آتے ہیں۔ ہمیں قبیح صورت کا مشاہدہ ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس قبیح کے سامنے آ جانے سے ہمارے باطن میں اس کے مقابل کا حسن متاثر ہوتا ہے جس کے سبب اس کا ادراک ہمیں ٹھیک اسی طرح ہو جاتا ہے جس طرح روشنی کے ہٹنے سے اندھیرے کا یا جسم سے گرمی کے خارج ہونے کے وقت سردی کا ادراک ہوتا ہے۔ گویا قبیح کا ادراک درحقیقت باطنی صدمہ کا مظاہرہ ہے۔

شخصی اوصاف شعور، علم و ارادہ، محبت اور شفقت وغیرہ کا مظاہرہ چونکہ جسمانی وجود کے ذریعہ ہوتا رہتا ہے اس لئے بھی انسان محسوسات کا گرویدہ ہوتا ہے۔ اس کے خیال میں جسمانی وجود سے صرفِ نظر کرنا شخصی اوصاف بلکہ خود شخصیت سے صرفِ نظر کرنے کا ہم معنی ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ نہ سماعت و بصارت کا حقیقی رشتہ ظاہر سے ہے اور نہ شخصی اوصاف کا سرچشمہ انسان کا ظاہری وجود ہے۔ سماعت و بصارت کی صورت میں درحقیقت صرف ہمارا باطنی ادراک نمایاں ہوتا ہے۔ محسوسات کا مشاہدہ خود ہمارے اپنے باطنی امکانات کا ادراک ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اجسام تو درحقیقت دیکھے ہی نہیں جا سکتے جب تک کہ ان کے ساتھ رنگ نہ ہو اور رنگ بھی روشنی بغیر نظر نہیں آسکتا۔ روشنی خود نہ جسم ہے اور نہ عرض ہے کہ کسی جسم میں حلول کئے ہوئے ہو۔ وہ جسم سے الگ ایک مستقل شے ہے۔

موجودہ سائنس بھی ایک ایسی سطح پر پہنچ چکی ہے جہاں مادّہ اور شعور کی دوئی نہیں معلوم ہوتی۔ گاڈل نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:-

"اب اچانک کوانٹم میکینکس (QUANTUM MECHANIC) کے موڑ کے آس پاس آبجکٹیو فیلڈ (OBJECTIVE FIELD) کے انکشاف نے علومِ طبعی کے ماہروں (THEORIST) کو ایک فکر میں ڈال دیا ہے۔ ان کے سامنے کائنات کا ایک غیر واضح منظر ہے جہاں ناظر اور منظور اس طرح متحد ہو جاتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا ان کا اتصال اتنا قریبی ہے کہ ہر ایک دوسرے میں منعکس ہوتا ہے، لیکن ایک دوسرے سے الگ ہونے یا حلول کرنے کی قوت ان میں نہیں ہے۔"!

"عدمِ تعین کے اس دائرہ میں تجربہ پر منحصر ہماری پہلے کی جانی ہوئی تمام علامات اور رفتار ہو لے ساتھ نہیں دیتے۔ توانائی اور مادّہ (ENERGY AND MATTER) کے تصور میں اتنی گہری تبدیلی کی ضرورت ہے کہ ان کا بنیادی مفہوم ہی ختم ہو جائے گا! توانائی مادّہ میں تبدیل ہوتی (CONDENSES INTO MATTER) اور مادّہ مادّیت سے الگ ہو کر مبدل بہ شعاع (RADIATION) ہو جاتا ہے۔ لائٹ کوانٹا (LIGHT-QUANTA) کے پھیلاؤ سے متعلق لہروں کے "مکان-زمان" (SPACE-TIME) میں پھیلاؤ کے لئے کسی بنیاد کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ وہ نہ تو کسی رقیق (FLUID) میں نہ کسی ٹھوس (SOLID) میں اور نہ کسی گیس (GAS) میں ہی لہراتے ہیں۔ یکسانیت (ANALOGY) کے غیر حقیقی تارہی انہیں پانی کی سطح پر لہراتی ہوئی لہر کے عکس سے باندھے رکھتے ہیں۔ درحقیقت وہ ممکنات کی لہریں (WANE OF PROBABILITY)

© rasailojaraid.com

ہیں شعور (CONSCIOUSNESS) کی لہریں ہیں ایک غیر محسوس عمل (ABSTRACT FUNCTION)
کے منحنی خط کے مبدل شکل (RARIATION) ہیں (CURVILINEAR RARIATION
OF ABSTRACT FUNCTION) جنہیں ہمارا شعور یا قوتِ فکر دور روز سمجھتی ہے''

خارج میں مادہ کے مطالعہ میں ناظر اور منظور میں دوئی باقی رہے گی، خواہ وہ باہم کتنے ہی ملے جلے اور گتھے ہوں۔ سائنس اس دوئی کی تشریح سے عاجز ہے۔ صرف روحانیات کے ذریعہ اس کی تشریح ممکن ہے۔

گفتگو کے وقت درحقیقت ہماری روح ہمکلام ہوتی ہے۔ روحانی کلام دماغ اور زبان کے واسطوں سے گذر کر ہوا میں تموّج پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح ہمارا ہر کام حقیقت میں ہماری روح کا عمل ہے۔ روح جس طور پر ہمارے جسم پر اثر انداز ہو کر اپنے افعال کو ظاہر کرتی ہے وہ بھی روح کی طرح بے کیف ہے۔ ہم اس کی تشریح نہیں کر سکتے۔

ہمارا کلام ہمارے روحانی کلام کی تمثالی شکل اور ہمارا سننا اور دیکھنا ہماری روحانی سماعت و بصارت کی محسوس صورت ہے۔ اسی طرح ہمارا ظاہری حسن وجمال اور محسوس اخلاق و کردار وغیرہ صفات بھی روحانی جمال و کردار کا پرتو ہیں۔ ہم جب کوئی چیز دیکھتے ہیں تو درحقیقت ہماری روح کو اپنے اندر اس کا لطیف انداز میں مشاہدہ ہوتا ہے۔ علم و ادراک کی دنیا میں حقیقی کارروائی صرف لطافت کی ہے۔ محسوسات اپنے وجود و بقا حتیٰ کہ مشاہدہ تک کے لئے لطافت کے محتاج ہیں۔ محسوسات اپنی اصلیت کے لحاظ سے لطیفِ محض ہیں۔

مذکورہ بالا تصریحات سے اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شخصیت کا حقیقی رشتہ محسوسات سے نہیں بلکہ اس کا اصل تعلق غیر محسوس وجودی صفات سے ہے۔ چونکہ شخصی اوصاف کا مظاہرہ یہاں جسم کے واسطہ سے ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے جب ہم کسی شخصیت کا تصور کرتے ہیں تو غیر شعوری طور پر اُسے محسوس تشکل دینے لگ جاتے ہیں۔ تشخص کے ساتھ تنزیہہ کا دامن تھامے رہنا ہمارے لئے بے حد مشکل ہوتا ہے۔

<u>ذاتِ خداوندی</u> | خدا کی ذات محیط و بسیط اور بے کیف ہے۔ اس کا وجود تعینات و محسوسات سے ماوراء ہے۔

اس کا سننا دیکھنا اور کلام فرمانا جملہ اوصاف وکمالات محسوسات سے بالاتر ہیں۔ اس کا کلام ظاہر
آواز کا پابند نہیں۔ دنیا میں صرف مثالی واسطوں کے ذریعہ اس کے کلام کا ادراک ہوتا ہے
فرمایا گیا ہے

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا	کسی بشر کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ
وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاۤءِ حِجَابٍ۔	اس سے کلام کرے مگر بذریعہ وحی یا کسی
. . . .	پردہ کی آڑ سے

اس کی رویت بھی اس کے کلام کے مثل ہے۔ یہاں کلام اور رویت دونوں صرف مثالی ا
میں ممکن ہیں۔

اول اور آخر صرف خدا ہے۔ ہو الظاہر و الباطن اسی کی صفت ہے۔ اس کی ذات میں
یا ترکیب نہیں پائی جاتی۔ اس لئے اوصاف اس میں الگ الگ موجود نہیں ہیں۔ صرف اس کی ذ
تی ان سب کا منشاء ہے۔ دو زمان میں ابدیت (ETERNITY) کا اور مکان (SPACE
لامحدودیت (INFINITY) کا مالک ہے۔ اس کے بارے میں تجسیم (-HROPOMORO
PHISM) اور ہمہ اوست[1] (PANTHEISM) دونوں تصورات غلط ہیں۔ وہ ہر جگہ حاضر
(IMMANENT) ہے۔ مگر اس کے ساتھ ماوراء (TRANSCENTENT) بھی ہے۔
حیثیت محسوسات سے بالاتر ہے۔

قرآن نے خدا کی ذات کا ایک ایسا تصور پیش کیا ہے جہاں مجاز کی جگہ صرف حقیقت کارفرما
قرآن نے تنزیہ کو اس درجہ کمال تک پہنچا دیا کہ تجسیم کا شائبہ تک باقی نہ رہا۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ	(۴۲ : ۱۱)	اس کے مثل کوئی نہیں۔
لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ		نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں لیکن وہ

---

[1] ہمہ اوست سے مراد وہ باطل نظریہ جس کے تحت کائنات اور اس کی تمام چیزوں کو خدا کا جزو ذاتی
یا جاتا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

© rasailojaraid.com

يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (۶: ۱۰۲) نگاہوں کا ادراک کر رہا ہے۔

اللہ کے لئے شریک فی النوع کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ شریک فی الوصف جائز ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى (۱۶: ۶۰) اور اللہ کی مثال بلند ہے۔

وجودِ انسانی اور خدا کے وجود میں مناسبت اور مماثلت

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے، اس جسمانی وجود سے الگ ہماری ایک مستقل حیثیت ہے۔ جسے ہم روح سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہماری شخصیت کا تمام تر انحصار ہماری روح پر ہے۔ ہماری روح محسوسات سے ماورا اور غیر مکانی وجود ہے۔ اسی لئے اس کے تمام اوصاف شعور، علم و ارادہ وغیرہ بھی غیر مکانی اور محسوسات سے اورا ہیں۔ اس طرح ہماری روح کو خدا کے وجود سے صد درجہ مناسبت حاصل ہے۔

جس طرح خدا کی ذات حواس کے حدود سے بلند سمت و جہت کی قید سے آزاد تحدیدات و تعینات سے ماورا ہے، اسی طرح ہماری روح بھی غیر مکانی ہے، وہاں کسی کیف و کم کا پتہ نہیں چلتا اور نہ سمت و جہت کا نشان ملتا ہے۔

جس طرح خدا ہی وہ حکیم و مدبر ہے جس کے سبب کائنات کا قیام ممکن ہوا، اسی طرح ہمارا جسمانی وجود ہماری روح کے سبب قائم رہتا ہے۔

جس طرح وہ ذات ہر چیز کو دیکھتی اور سنتی ہے مگر نہ وہاں رنگ و صورت وغیرہ کسی قسم کی مادیت کا گذر ہوتا ہے اور نہ آواز اس کی سمع سے ٹکراتی ہے، اسی طرح ہماری روح لطیف انداز میں دیکھتی اور سنتی ہے، اس تک کسی جسم و رنگ اور آواز کی لہر کا گذر نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ خواب کی حالت میں یا آنکھ کان بند رکھنے کے باوجود عالمِ تصور میں ہماری روح دیکھتی اور سنتی ہے حالانکہ نہ اس وقت کوئی آواز روح سے ٹکراتی ہے اور نہ کسی رنگ و روپ کا اس تک گذر ہوتا ہے۔

پھر جس طرح خدا کے کلام کی تنزیہہ کا حال یہ ہے کہ نہ اس میں الفاظ و آواز کی حد بندیاں ہیں اور نہ تلفظ کے قیود ہیں۔ مگر کلام میں حقائق و معانی بھی ہیں اور سماع و اسماع بھی ہے۔ الفاظ و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لطف کے قیود، عالمِ خلق میں آکر نمایاں ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہم اپنی روح کی آواز کو بے تکلف دل کانوں سے سنتے ہیں حالانکہ اس کے کلام میں نہ کسی قسم کی آواز ہوتی ہے اور نہ اس میں الفاظ ہوتے

اس طرح اپنے روحانی وجود کے سبب ہمیں خدا کی ذات اور اس کی تنزیہہ و تقدیس کا اندازہ ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہماری عقل اسے بھی باور کرنے لگتی ہے کہ ہماری روح اور خدا وجود میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔

خدا کا حُسنِ ذاتی | حُسن و جمال ہمارے باطن کی یافت ہے۔ یہی باطنی حُسن ہے جسے خارج میں مح رنگوں اور صورتوں کے ذریعہ عریاں کیا گیا ہے۔ ہر شئے میں زیبائش اور رعنائی و دلکشی کا مفہوم باطن کا پیدا کردہ ہے۔ پھولوں کی عطر بیزی ہو یا پرندوں کی نغمہ سنجی۔ حیوانات کے اجسام ہوں تنوع۔ ہر ظہور میں نظر افروزی کی نمود ہمارے باطنی احساس کی رعایت سے پیدا ہوتی ہے۔

حُسن و جمال کا تعلق ہمارے شعور و بینائی سے ہے۔ بینائی کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ لطافتِ محض ہے۔ اس لئے جمال یا حسن بھی لازماً اپنی حقیقت کے اعتبار سے محسوسات سے اور ا لطیف شئے ہے جس سے خدا کی ذات کا متصف ہونا ہرگز بعید از قیاس نہیں ہوتا۔ جو ذات اپنی کار کے ہر گوشہ میں سرچشمۂ رحمت و فیضان اور منبعِ حسن و کمال ثابت ہو رہی ہے وہ یقیناً اپنی ذات کے اع سے بھی سراپا حُسنِ مطلق اور سرچشمۂ رحمت و شفقت ہوگی۔

مسئلۂ تصور | جس وقت روح کا تصرف جسم پر باقی نہ رہے گا، ہمارا جسمانی وجود ختم ہو جائے گا، اسے موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ عالمِ تصور میں موت کے بعد بھی ہم اپنے کو موجود پاتے ہیں۔ حقیقت میں کا عدم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ فطری طور پر ہماری عقل روح کے وجود کو باور کرتی ہے۔ قربت باعث ہم ذوقی طور پر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ روح میں تشخص کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ وہ تشخص اوصافِ حیات، علم و ارادہ و اختیار اور ترحم و شفقت وغیرہ سے کمال درجہ متصف ہے۔ ہم اس جسما وجود کو نظر انداز کرنے کے بعد بھی اپنے روحانی وجود کے تصور میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تصور کے ضروری نہیں ہے کہ ہم اس کی کنہ کو بھی پا لیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمارے روحانی وجود اور خدا کے وجود میں صد درجہ مناسبت پائی جاتی ہے۔ ہم اپنے روحانی وجود کے تصور کے ذریعہ خدا کی پُر اسرار شخصیت کا تصور بھی بآسانی کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہماری عقل خدا کی ذات اور اس کی شخصیت کے باور کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اور صرف یہی نہیں کہ خدا کی عظیم شخصیت کا شعور ہمارے اندر جاگ اٹھتا ہے بلکہ ہم یہ باور کرنے لگتے ہیں کہ وہ عظیم ہستی سراپا جمیل اور حُسن و کمال کی مالک بھی ہے۔

اس کامیابی کے بعد عقیدہ کے لئے ایک ایسا تصور مل جاتا ہے جو اس کے پہلے ممکن نہ تھا۔ ہم ایک عظیم اور پُر اسرار ہستی کے تصور میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو اگرچہ بے انتہا بلندی پر ہے لیکن اپنے عجز و نیاز کے ہاتھوں سے اس کے دامنِ کبریائی کو تھامے رہنا اب ہمارے لئے مشکل نہیں رہتا۔

جب ہماری روحانی شخصیت کو اس کے غیر مکانی ہونے کے باوجود عقل باور کر سکتی ہے تو خدا کی ذاتِ بے کیف کو بدرجۂ اولیٰ باور کرے گی۔ اسی طرح یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ بندوں کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت یقیناً محسوسات سے ماوراء اور بے کیف ہوگی۔

حقیقت کی جو معرفت انسان کو حاصل ہوتی ہے اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ آدمی وجدانی طور پر حقیقت کو پالے۔ اس کی عقل نہ صرف خدا کے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور رہے بلکہ اُسے یہ بھی باور ہو جائے کہ اس کا خدا لازماً شخصی اوصاف و کمالات کا مالک ہے۔ اس کے لئے حقیقت کی کُنہ کو پالینا ضروری نہیں ہے۔ ہم روزانہ ایک دوسرے کی باتیں سنتے ہیں۔ لیکن آج تک کسی سائنسداں کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ فضا میں آواز کی جو لہریں پیدا ہوتی ہیں ہمارے شعور پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہمارا دماغ کس طرح انھیں اپنی گرفت میں لے کر اس سے ہمیں باخبر کر دیتا ہے۔ اپنے شعور کی حقیقت اور اس کے خارجی اثرات کے قبول کرنے کی کیفیت سے بے خبر رہنے کے باوجود ہم اپنے شعور اور اس کے متاثر ہونے کو باور کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں کوئی بے اطمینانی نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر اپنی بساط کی حد تک ہماری عقل حقیقت کو باور کرنے لگ جائے تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کی شخصیت کے باور کرنے کے بعد بھی انسان کی حیرانی دور نہیں ہوتی۔

© rasailojaraid.com

تصوّر میں آنے کے بعد بھی خدا کی شخصیت پراسرار ہی رہتی ہے۔ اس کی بالاتری و بالادستی میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ وہ اپنی عظمت اور رفعت کے ساتھ منظرِ عام پر نہیں آ جاتا۔ اُس کی جناب اِس سے اعلیٰ و ارفع ہے کہ ہر وارد اور صادر کی گذرگاہ بن جائے یہاں تو ادراک کا حاصل یہ ہے کہ ادراک کی نارسائی کا ادراک ہو جائے۔ البتہ وہ حیرانی جو معرفت کے سبب پیدا ہوتی ہے اِس حیرانی سے بالکل مختلف ہے جو کسی کو عدمِ معرفت کی بنا پر ہو سکتی ہے۔

اس میدان میں نظری کاوشوں کو اس سے آگے بڑھانا بے حد خطرناک اور لاحاصل ہے۔ انسان کے لئے محفوظ راستہ یہ ہے کہ ایسے موقع پر اپنے عجز و نارسائی کا اعتراف کر لے۔ نظری کاوشوں سے معاملہ کی گتھی نہ کبھی سلجھ سکی ہے اور نہ آیندہ اس کی امید کی جا سکتی ہے۔ اسی لئے سلفیہ اور اصحاب الحدیث نے تاویلِ صفات میں کاوشوں سے کام لینے کو ہمیشہ غلط سمجھا اور اپنے لئے صرف تفویض کا مسلک پسند کیا۔ تفویض و توقف کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے لئے جو صفات بھی قرآن سے ثابت ہیں۔ مثلاً ید، وجہ وغیرہ ان کا اثبات کرے۔ تاویلِ صفات میں کاوشوں سے کام نہ لے۔ البتہ انھیں اپنے پر قیاس نہ کرے بس یہ ملحوظ رہے کہ جیسی اس کی ذات ہے اُسی کے شایانِ شان اس کی صفات بھی ہیں جن کی کنہ اور حقیقت کو ہم نہیں پا سکتے۔ اصحاب الحدیث نے جہمیہ کے انکارِ صفات کو تعطیل قرار دیا۔ معتزلہ اور اشاعرہ کی تاویلوں میں بھی انھیں تعطیل کی بو محسوس ہوئی۔ متکلمین حضرات نے جب ان پر تجسیم و تشبیہ کا الزام لگایا تو انھوں نے جواب میں یہی کہا کہ تمہارے تعطل سے تو ہمارا نام نہاد تشبیہ ہی بہتر ہے۔ سلب و نفیِ صفات کے بعد تو اثبات کے لئے کچھ بھی باقی نہیں رہتا جس کو عقیدے کی بنیاد بنایا جا سکے۔ متاخرین میں امام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ نے اپنے لئے وہی مسلک پسند فرمایا جو اسلاف کا مسلک تھا۔ تفویض کے طریقے سے یہ لوگ بھی الگ نہ ہوئے۔

علمِ کلام کے ذریعہ نظری کاوشیں بہت آگے بڑھیں جس کے نتیجہ میں مختلف مذاہب اور آراء پیدا ہوئے۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ معاملہ کے سلجھانے میں ہر ایک ناکام رہا۔

امام رازیؒ آخر میں اقرار کرتے ہیں :۔

لقد تأملت الطرق الکلامیہ   میں نے علم کلام اور فلسفہ کے طریقوں کو خوب پرکھا

والمناہج الفلسفیة، فما رأیتها تشفی علیلاً ولا تروی غلیلاً، ووجدت اقرب الطرق طریقة القرآن فی الاثبات "الیه یصعد الکلم الطیب" "الرحمٰن علی العرش استویٰ"۔ واقرأ فی النفی "لیس کمثله شیٔ" "ولا یحیطون به علماً"، ومن جرب مثل تجربتی عرف مثل معرفتی والضا فمن اعتبر ما عند الطوائف الذین لا یعتصمون بتعلیم الانبیاء وارشادھم واخبارھم وجدھم کلھم حائرین ضالین شاکین مرتابین او جاھلین جھلاً مرکبا ....

(رسائل ابن تیمیہ مطبوعہ مصر ص ۱۰۹)

....

....

بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ نہ تو ان میں کسی بیمار کے لئے شفا ہے نہ کسی تشنہ لب کے لئے سیرابی۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ حقیقت سے قریب تر راستہ وہی ہے جسے قرآن نے اختیار کیا ہے (یعنی نہ اثبات کا دامن چھوٹے اور نہ تنزیہ میں فرق آنے پائے۔ اُسے تجسیم اور تعطل دونوں سے بچایا جائے) اثبات میں یہ آیتیں پڑھ لیجے "الیه یصعد الکلم والطیب" اور "الرحمٰن علی العرش استویٰ"۔ اور نفی تشبیہ میں "لیس کمثله شیٔ" اور "ولا یحیطون به علماً"۔ جو کوئی میری طرح اس معاملہ کا تجربہ کرے گا اُسے بھی میری طرح اس حقیقت کا علم ہو جائے گا۔ اور نیز جو شخص ان لوگوں کے اقوال میں غور کرے گا جنھوں نے انبیاء کی تعلیمات اور ہدایات سے استدلال نہیں کیا تو وہ انھیں تحیر۔ تردد، گمرہی اور جہلِ مرکب میں مبتلا پائے گا۔

دیدارِ باری تعالیٰ جنت میں رویت اور دیدار منصوص ہے۔ مومن خدا کو جنت میں دیکھے گا لیکن اس کی رویت محسوسات سے وراء الوراء ہوگی۔ روحانیت کے غلبہ سے انسان اس کی رویت کا تحمل کر سکے گا۔ آخرت کے ترقی یافتہ نظام میں "حقیقتیں" ظاہر ہونے کے لئے مادی لباسوں کی محتاج نہ رہیں گی۔ وہاں ان کی بے نقاب جلوہ گری ہوگی۔ اِس عالم کے برخلاف وہاں کثافت پر لطافت کو غلبہ ہوگا۔ جو کچھ یہاں مخفی ہے

© rasailojaraid.com

ؤہاں نمایاں ہوجائے گا۔ قلب و نظر کے درمیان وہاں قطعاً کسی قسم کی بیگانگی باقی نہ رہے گی۔

خدا ہمارے فطری مطالبات کا جواب ہے

اس عالم کے بے ثبات سہاروں کے درمیان ہمارے لئے خدا ہی ایک مستحکم سہارا ہے۔ دل کے خلوت خانے سے لیکر زندگی کے ہنگاموں تک کہیں بھی اس سے ہمارا تعلق منقطع نہیں ہوتا۔ ایسے قوانین جن کی پیروی پورے اعتماد و اطمینان کے ساتھ کر سکیں صرف وہی عطا کر سکتا ہے۔ خدا کا تصوّر ایک مطلوب و محبوب تصوّر ہے جس سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل ہونا ایک ناقابلِ عفو جرم ہے۔ خدا اور اس کے بندے کا رشتہ نہایت قریبی رشتہ ہے۔ جو رشتہ روح اور جسم کے درمیان ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ قریبی تعلق بندہ کا اپنے خدا سے ہوتا ہے۔ مناسبت کے علاوہ محبت کا مدار قربت پر بھی ہے۔ اس لئے خدا پرستی اور خدا طلبی کی زندگی انسان کی اپنی اصلی زندگی ہے۔ خدا کی اطاعت ایک ایسے حکمراں کی اطاعت ہے جس کا تختِ حکومت خود ہمارا عمقِ قلب ہے۔

اُسوۂ نبوی حصّہ اوّل

یعنی مصائب سرورِ کونینؐ کا بیانؐ

رحمتِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی ہر منزل میں سراپا اُسوہ اور نمونہ ہے، ہم اپنی زندگی کے جس حصّہ میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ پاک سے سبق حاصل کرنا چاہیں گے ہمیں سبق ملے گا، خواہ دُکھ اور مظلومی کی زندگی ہو خواہ اقتدار و مسرّت کی۔ اُسوۂ نبویؐ کے اس حصّہ میں سیدالکونینؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا وہ پہلو نمایاں کیا گیا ہے جس کا تعلق مصائب اور اذیتوں سے ہے موجودہ دور میں اس ملک کے مسلمان جس دور سے گذر رہے ہیں اس کا مطالعہ ان کے لئے خاص طور پر مفید اور سبق آموز ہوگا۔ کتاب اس انداز میں مرتب کی گئی ہے کہ آپ اس کو شروع کرنے کے بعد پڑھتے ہی چلے جائیں گے اور ختم کرنے کے بعد محسوس کریں گے کاش یہ سلسلہ اور دراز ہوتا۔ اپنے رنگ کی بہترین کتاب۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ قیمت مجلّد ۳؍

© rasailojaraid.com